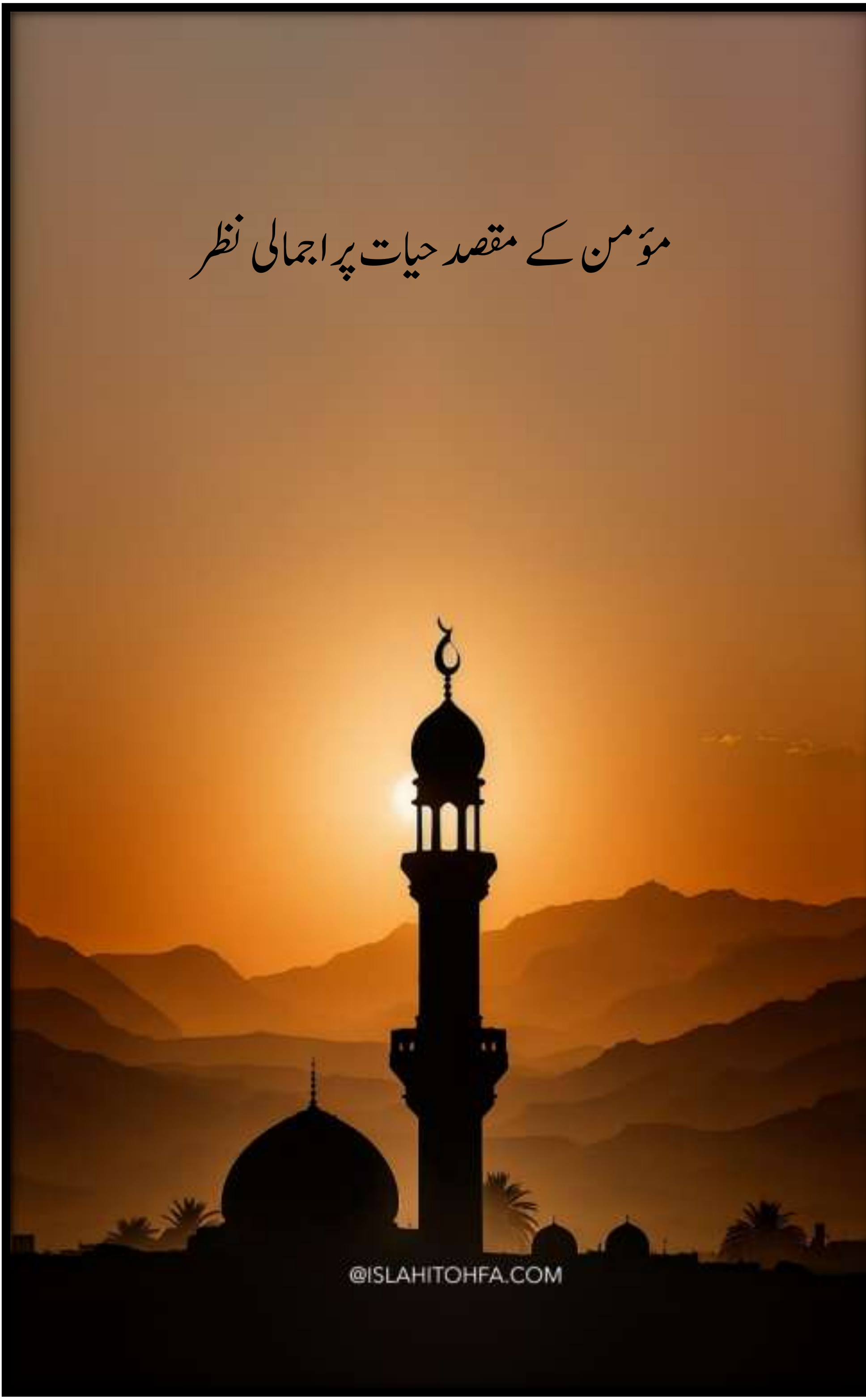

مؤمن کے مقصد حیات پر اجمالی نظر
@ISLAHITOHFA.COM

جملہ حقوق اشاعت بحق مؤلف محفوظ

تفصیلات طباعت

کتابچہ	مؤمن کے مقصد حیات پر اجمالی نظر
مؤلف	محمد ارشاد علی مولوی عالم (نظامیہ)
صفحات	۳۲
اشاعت	ستمبر ۲۰۱۲
قیمت	مفت
اہتمام	صاحبزادہ محمد طاہر علی
	اشوک نگر ، بی۔ایچ۔ای۔یل
	حیدرباد
ای میل	islahitohfa@gmail.com

تنبیہ

اس کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔ یہ دستاویز ایک آن لائن کتاب ہے، اس کتاب کو خصوصی طور پر انٹرنیٹ کے ذریعہ مفت فراہم کرنے کے لئے فارمیٹ اور ڈیزائن کیا گیا ہے۔اس کتاب کو اسی شکل میں بغیر کسی تبدیلی کے، اس کی تقسیم، طباعت، فوٹو کاپی اور الیکٹرونک ذرائع کے ذریعہ اس کی تقسیم اور اس کے مواد کو پھیلانے کی اجازت دیتا ہے۔اس شرط کے ساتھ کہ اس سے مالی طور پر نفع حاصل نہ کی جائے۔

ترتیب

ISLAHI TOHFA

بِسْمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحْمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

سورہ انعام کی آیت نمبر ۱۶۳-۱۶۲

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ ﴿لَا شَرِيكَ لَهُ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ﴾ [الأنعام: ١٦٣- ١٦٢]

(اے رسول ﷺ آپ اس دین ابراہیم کی کسی قدر تفصیل کرتے ہوئے) کہ دیجئے کہ یقیناً میری نماز اور میری ساری عبادات اور میرا جینا اور مرنا، یہ سب خالص اللہ ہی کیلئے ہے جو مالک ہے سارے جہاں کا، اسکا (استحقاق عبادت یا تصرفات ربوبیت میں) کوئی شریک نہیں ہے اور اس دین مذکور پر مجھ کو رہنے کا حکم ہوا ہے۔ اور (حکم کے موافق) ہیں (اس دین والوں میں) سب ماننے والوں سے پہلا ماننے والا ہوں۔

<u>**دوسرا ترجمہ**</u>:-اے رسول ﷺ آپ فرما دیجئے کہ میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، مرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کیلئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔

<u>**تیسرا منظوم ترجمہ**</u>:-

کہو یہ سب نماز و صدقہ، موت وزندگی میری
خدا کل جہاں کے ذات واحد کیلئے ٹھری

یہی تاکید ہے مجھ کو کہ میں ایسا کئے جاؤں
میں سب سے پہلے اسکے حکم برداروں میں کہلاؤں

ابتدائیہ :- مذکورہ دونوں آیات سورۃ الانعام کی ہیں۔ نَعَمٌ کے معنی اونٹ اور چوپائے کے ہیں اور اس کی جمع اَنْعَام ہے یعنی مویشی۔ کیونکہ اس سورت کے بعض مویشیوں کی حرمت اور بعض کی حِلّت کے متعلق اہل عرب کے توہمات کی تردید کیگئی ہے اسی مناسبت سے اسکا نام اَلْاَنعَام رکھا گیا ہے۔ اس صورت میں ۲۰ رکوع اور ۱۶۵ آیات ہیں۔

زمانہ نزول :- یہ سورت مّکی دور میں آخری زمانے یعنی نبوت کے ۱۳ ویں سال یا ہجرت مدینہ سے ایک سال قبل مکّہ میں نازل ہوئی۔ اللہ کے رسول مکّے میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے ۱۲ سال گزر چکے تھے قریش مکّہ کا ظلم اور انذار و رسانی زوروں پر تھی، اسلام قبول کرنے والوں کی بڑی تعداد تنگ آکر مکّہ چھوڑ کر حبشہ ہجرت کر گئے تھے اور مکے میں رسول خدا کی حمایت کیلئے نہ تو چچا ابو طالب تھے اور نہ آپکی زوجہ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ اس لیے دنیوی سہاروں سے محروم اور شدید مزاحمتوں کے مقابل دین کا فریضہ تبلیغ انجام دے رہے تھے۔ رسول خدا پر ۱۰ نبوی سے ۱۳ نبوی تک ۳ سال کا عرصہ آپ کیلئے اور آپکے صحابہ کیلئے سخت مصیبت کا دور تھا۔ اسی دوران طائف گئے تو وہاں پر بھی حمایت نہ ملی۔ حج کے موقع پر عرب کے ایک ایک قبیلہ سے آپ دعوت اسلام کی بات کرتے رہے لیکن وہاں سے کوئی جواب نہ ملا۔ ان ہی حالات میں مذکورہ سورت نازل ہوئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ کی روایت ہے کہ یہ پوری

سورت مکّہ میں بیک وقت نازل ہوئی اس کیفیت سے کہ ۷۰ ہزار فرشتے اس سورت کے ساتھ تسبیح میں مشغول تھے۔

قرآن مجید میں پانچ سُورے ایسے ہیں جو الحمد اللہ سے شروع ہوئے ہیں۔ (۱) سورۃ الفاتحہ (۲) سورۃالانعام (۳) سورۃالکہف (۴) سورۃ سبا (۵) سورۃ فاطر۔

سورۃ مذکورہ میں مضامین کی نوعیت :- یہ سورت توحید کے تمام اصول اور قواعد پر مشتمل ہے (۱) شرک کا حال (۲) توحید کی دعوت (۳) عقیدہ آخرت کی تبلیغ (۴) توہمات اور روایات جاہلیہ کی تردید (۵) اصول اخلاق کی تلقین (۶) دعوت اسلام کے خلاف لوگوں کے اعتراضات (۷) طویل جدو جہد اور اسکے مقابل خاطر خواہ دعوت کے نتائج نہ نکلنے پر دل گرفتگی اور دل شکستگی اور اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے تسلّی دیگئی (۸) مخالفین کو تنبیہ اور تہدید۔

زیر نظر مضمون کا تعلق سورۃ الانعام کی صرف دو آیات یعنی ۱۶۲ - ۱۶۳ سے ہے۔ ان دونوں کو سمجھنے کیلئے اسبات کو سمجھنا ضروری ہے کہ صورت الانعام کی آخری چھ آیات یعنی ۱۶۱ - ۱۶۵۔ ایسی ہیں جن میں اس بات کی تشریح کی گئی ہے کہ لوگوں نے دین حق میں افراط و تفریط اور کمی بیشی کر کے مختلف دین بنائے۔ حضرت موسیؑ کی طرف لوگوں نے یہودیت کو اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف میسیحیت کو منصوب کر رکھاہے اور یہ دونوں بھی جانتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ان سے بہت پہلے گزر چکاہے۔ان کے علاوہ مشرکین عرب بھی طریقہ ابراہیمی کو مانتے ہیں لیکن اپنی جہالت کی وجہ سے بت پرستی کر رہے تھے۔اسلئے آیت نمبر ۱۶۱ میں ارشاد ہے کہ اے رسول صلعم آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میرے رب نے ایک

سیدھا راستہ مجھ کو بتلا دیا ہے یعنی میں تمہاری طرح اپنے خیالات یا آ بائی رسومات کے تابع ہو کر کوئی راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ میرے رب نے مجھے یہ راستہ بتلایا ہے۔ لفظ رب سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اسکی شان ربوبیت کا تقاضہ ہے کہ وہ بندوں کو صحیح راستہ بتلائے۔ تم بھی اگر چاہو تو اسکی طرف آؤ، تمہارے لئے بھی سامان ہدایت موجود ہے۔

دوسری آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ دین، دینِ قِیَم ہے یعنی مستحکم دین ہے۔ قائم رہنے والا دین ہے۔ یعنی اللہ کی طرف سے مضبوط بنیادوں پر قائم ہے اور تمام سابقہ انبیاء کرام کا یہی دین رہ چکا ہے۔

موجودہ فرقوں میں سے یہود و نصارىٰ اور مشرکین عرب یہ سب یہ ثابت کرنیکی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ سب بھی دین قیم اور دین ابراہیم ہی پر قائم ہیں اور ان کا مذہب بھی ملّت ابراہیمی ہی ہے۔ ان کی اس خوش فہمی اور مغالطہ کو دور کرنے کے کیئے فرمایا کہ وہ ابراہیمؑ غیر اللہ کی عبادت نہیں کرتے تھے وہ شرک سے نفرت کرنے والے تھے اور تم لوگ سب کے سب شرک میں مبتلا ہو گئے ہو۔ وہ اس طرح ہے کہ یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور انصار حضرت عیسیٰ علیہ سلام کو اور مشرکین عرب ہزارو پتھروں کو خدائی میں شریک مان لئے۔ ان سب کے باوجود تم لوگوں کو یہ حق کس طرح حاصل ہو گیا کہ تم یہ دعوی کریں کہ تم لوگ ملّت ابراہیمی کے پابند ہیں۔ یہ حق اور یہ دعوی صرف مسلمان کر سکتا ہے جو شرک سے اور کفر سے پاک ہے۔

تیسری آیت میں فرمایا کہ اے رسول صلعم آپ ان سے فرماں دیجیے کہ میری نماز اور میری تمام عبادات اور میری پوری زندگی اور پھر موت یہ سب اللہ رب العالمین ہی کیلیئے ہے۔ اور مجھے مشرکین اور یہود اور نصاریٰ کی پیدا کردہ خرافات اور بدعات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ملّت ابراہیمی تو وہی ہے جس پر میں ہوں نہ کہ جس کا تم دعوی کرتے ہو، دین حق تو توحید ہے جو خاص مذہب ابرد ھیمی ہے۔

نماز - مسجدی اعمال اور مسجدی ہدایات :-

آیت مذکورہ میں اعمال کے ذکر کے تحت سب سے پہلے نماز کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ وہ تمام اعمال صالحہ کی روح اور دین کا محور ہے اسکے بعد تمام اعمال، عبادات کا اجمال ذکر فرمایا پھر اسکے آگے پوری زندگی کے اعمال اور احوال کا ذکر کیا اور آخر میں موت کا۔ ان سب کا ذکر کر کے فرمایا کہ یہ سب چیزیں صرف اللہ ہی کیلیئے ہیں۔ جس کا کوئی شریک نہیں ہے، یہی ایمان کامل ہے اور اخلاص کامل ہے کہ انسان اپنی زندگی کے دوران ہر حال میں اور ہر کام میں اُس کو پیش نظر رکھے کہ میرا اور تمام جہاں کا ایک رب ہے اور میں اس کا بندہ ہوں اور میں ہر وقت اسکی نظر میں ہوں۔

ایسی صورت میں یہ دل، دماغ، آنکھ، کان، زبان اور ہاتھ پیر،
قلم اور قدم اُسکی مرضی کے خلاف نہ اٹھنا چاہیے۔ یہی وہ مراقبہ اور سوچ ہے کہ اگر انسان اسکو اپنے دل و دماغ میں منحصر کرلے تو صحیح معنی میں انسان، کامل انسان ہو جائے اور دوسری طرف گناہ اور معصیت سے دور رہے۔ مذکورہ آیت کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ حضرت ابو موسی اشعریؓ فرمایا کرتے تھے کہ میرا دل

چاہتا ہے کہ ہر مسلمان اس آیت کو بار بار پڑھا کرے اور اس کو وظیفہ زندگی بنا لے۔

آیت میں نماز اور تمام عبادات کا اللہ کیلئے ہونا تو ظاہر ہے کہ اس میں شرک نہ ہو، ریا نہ ہو اور کسی دنیوی مفاد کا دخل نہ ہو۔ اور زندگی اور موت کا اللہ ہی کیلئے ہونا اسکے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ میری موت اور حیات اسی کے قبضہ میں ہے ایسی صورت میں زندگی کے اعمال اور عبادات بھی اُسی کیلئے ہونا چاہیے۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو اعمال، زندگی سے وابستہ ہیں وہ بھی صرف اللہ ہی کیلئے ہیں جیسے نماز، روزہ اور لوگوں کے ساتھ معاملات کے حقوق اور فرائض وغیرہ۔ اور خو اعمال موت سے متعلق ہیں یعنی وصیت وغیرہ۔ اسکے بعد فرمایا کہ مجھے اللہ کی طرف سے اسی قول و قرار اور اخلاص کامل کا حکم دیا گیا ہے اور اس خصوص میں پہلا فرمابرداروں میں ہوں کیونکہ ہر اُمّت کا پہلا مسلمان خود نبی یا رسول ہوتا ہے جس پر وحی شریعت نازل کی جاتی ہے۔

مسجدی اعمال :- ہر عمل کا اثر ہوتا ہے مسجد کے اعمال کے اثرات کا میدان بیرون مسجد ہے اور بیرون مسجد، مسجدی اعمال کا اثر نہیں رہا۔ نماز، غیر شعوری طور پر رسمی افعال کا ایک پُر اسرار مجموعہ ہو گئی ہے۔ "مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ" مسجد اعمال کی فکر میں داخل ہے لیکن لوگوں کی فکر یہ ہے کہ آج کیا کھاؤں اور کل کتنا کماؤں۔ نماز ذریعہ ہدایت ہے اس طرح لوگ مسجدی ہدایات پر عمل نہیں کرتے۔ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ - نماز پڑھنے کے بعد بھی نہ رسوت سے رکھتا ہے نہ دھوکہ سے اور نہ جھوٹ سے نہ گالی گلوچ سے نہ غیر اسلامی چہرہ رکھنے سے نہ غیر اسلامی لباس

سے۔ اس طرح مسجد میں اللہ کا حکم اور بیرون مسجد نفس کا حکم۔ اسلئے وہ نماز نہیں ہوا بلکہ رسم پرستی ہوئی یا پھر خود کو دھوکہ دے رہا ہے جو حماقت کی دلیل ہے۔ لوگ عبادت کرتے ہیں لیکن عبادت میں بھی من چاہی، فجر تو پڑھنے کا سوال ہی نہیں آتا۔ لوگ نماز میں قرآن سنتے ہیں لیکن اس سے ہدایت نہیں لیتے اسلئے کہ اسکو سمجھ نہیں سکتے۔ لوگ علم دین کی اہمیت کو جانتے ہیں لیکن اسے حاصل کرنے کی فکر اور محنت کیلئے تیار نہیں ہیں۔ لوگ دین کی داخلی روح سے دور اور ساری عمر ظاہری رسومات ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ لوگوں میں خدا پرستی سے زیادہ بزرگ پرستی کا پہلو غالب ہے۔

دھوم دھام والا اسلام، براہ راست ہندو روایات سے اخذ کیا گیا ہے کیونکہ ہندوؤں کے پاس خشوع و خضوع اور تقویٰ والے دین کا کوئی تصوّر ہی نہیں ہے۔ لوگ اصلاح کا کام کر کے اُس کو تبلیغ کا کام سمجھنے لگے، لوگ نیک عمل کر کے اسکو دینی علم کے حصول کے مترادف سمجھ رہے ہیں اس طرح آدمی فریب عمل کو حقیقت عمل سمجھ گیا ہے اسی لئے نتیجہ عمل مفقود ہے۔

مسلمانوں میں علم کی کمی کیوجہ سے اُن کا ذہنی ارتقاء اس قدر کم ہے کہ اُن کے درمیاں یا تو برکت اور فضیلت پر مبنی تحریکیں چلتی ہیں یا پھر جذباتی سیاست پر مبنی تحریکیں۔ چنانچہ اکثر مسلمان، بزرگوں کی موت کو وصال سے تعبیر کرتے ہیں اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ لوگ موت کے بعد خدا سے مل گئے ہیں۔ دیگر الفاظ میں موت نے انکو زیادہ اونچے مقام پر پہنچا دیا ہے اُن کو مزید روحانی طاقت حاصل ہو گئی ہے کہ ہماری مرادیں پوری کر سکتے ہیں، ہماری حاجتوں میں ہمارے کام آتے

ہیں اسطرح شعوری یا غیر شعوری طور پر وصال کا نظریہ عوام کے اندر، قبر پرستی کے پیچھے کام کر رہا ہے۔ حالانکہ اس نظریہ کی کوئی شرعی بنیاد نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام میں وفات کا تصور ہے لیکن وصال کا تصور نہیں ہے۔

قربانی کا ذکر :- آیت مذکورہ میں قربانی کا ذکر آیا ہے۔ قرآن مجید میں قربانی کے جانور کو شَعِیْرَہ کہتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اسلام میں کچھ چیزیں بطور شَعِیْرَہ یا علامت مقرر کیگئی ہیں ان میں سے ایک قربانی کا جانور بھی ہے۔ شعیرہ ایک جانور کو کہتے ہیں (خواہ وہ اونٹ ہو یا گائے ہو یا بھیڑ ہو) جو معنوی حقیقت (پوشیدہ حقیقت) کیلئے ظاہری علامت کا کام دے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ بندے اپنے مخالف اسلام جذبات کو اللہ کی خاطر ذبح کر دیں۔ یہ ایک نفسیاتی ذبح کی علامت ہے کہ آدمی ایک جانور کو ذبح کرے اور ذبح کے وقت آدمی اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کرتا ہے۔ ﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾[الأنعام: ١٦٢] اس سے معلوم ہوا کہ جانور کی قربانی ایک معنوی حقیقت کی ایک ظاہری علامت ہے۔اس شخص کی قربانی، قربانی ہے جو جانور کو ذبح کرتے وقت پر تصور کرے کہ وہ اپنے پورے وجود کو اللہ کیلئے قربان کر رہا ہے جس کے لئے ذبیحہ اسکے اپنے جذبات اور احساسات کے ذبیحہ کا محسوس پیکر بن جائے۔ (ذیل کی آیت سے قربانی کی مزید تشریح ﴿لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ ۚ كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ ۗ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ﴾[الحج: ٣٧]، اللہ کو نہیں پہنچتا ہے ان کا گوشت اور نہ ان کا خون لیکن اسکو پہنچتا ہے تمہارے دل کا ادب (یعنی تقویٰ) پہنچتا ہے۔ اسطرح ان کو بس میں کر دیا تمہارے کہ تم اللہ کی بڑائی پڑھو اسبات پر کہ تمکو راہ سمجھائی اور بشارت سنا دیجئے نیکی کرنے والوں کو

سبب نزول :- زمانہ جاہلیت میں اہل عرب جس طرح بتوں کی قربانی کا گوشت بتوں پر لے جا کر چڑھاتے تھے اسی طرح اللہ کے نام کی قربانی کا گوشت کعبہ کے سامنے لا کر رکھتے تھے اور خون اسکی دیواروں پر لگاتے تھے اُن کے نزدیک یہ قربانی گویا اسلئے کی جاتی تھی کہ اللہ کے حضور اس کا خون اور گوشت پیش کیا جائے ایسے عمل کی تردید میں کہا گیا کہ گوشت اور خون اللہ کے سامنے نہیں پہنچتا بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ قربانی سے مقصود اصل اس پر اللہ کا نام لینا اور اسکے حکم کی بجا آوری دلی اخلاص کے ساتھ کرنا ہے۔

یہی حکم دوسری تمام عبادات کا ہے کہ نماز کی نشست و برخواست اور روزے میں بھوکا پیاسا رہنا اصل مقصود نہیں ہے بلکہ اصل مقصود اللہ کے حکم کی تعمیل دلی اخلاص اور محبت کے ساتھ ہے اگر عبادات اس سے خالی ہیں تو صرف صورت اور ڈھانچہ ہے روح غائب ہے۔ مگر عبادات کی صورت اور ڈھانچہ بھی اس لیے ضروری ہے کہ حکم ربانی کی تعمیل کیلئے اُسکی طرف سے یہ صورتیں متعین فرما دیگئی ہیں۔

تشریح:- دنیا میں اگر مویشی یعنی اونٹ، گائے، بیل، بھیڑ، بکری وغیرہ نہ ہوتے اور صرف شیر- ریچھ بھیڑیے ہوتے تو ان سے خدمت لینا انسان کیلئے مشکل ہو جاتا اور ان کو عمومی طور پر قربان کرنا تو بالکل ناممکن ہو جاتا ہے۔اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے صرف وحشی اور درند جانور ہی پیدا نہیں کئے بلکہ کچھ ایسے جانور بھی پیدا کئے ہیں جن میں فطری طور پر یہ مزاج موجود ہے کہ وہ اپنے آپ کو انسان کے قابو

میں دے دیتے ہیں اور جب انسان انکو غذا یا قربانی کے لئے ذبح کرتا ہے تو اسوقت اُنکی تسخیری فطرت اپنی آخری حد پر پہنچ جاتی ہے۔

قربانی تو ایک علامتی فعل ہے۔ جانور کی قربانی اس انسان کی ایک ظاہری تصویر ہے جو اپنے آپ کو ذبح کر چکا ہے۔ یہ دراصل خود اپنا ذبیحہ ہے جو جانور کے ذبیحہ کی صورت میں مثل ہے، وہ لوگ خوش قسمت ہیں جن کیلئے جانور کی قربانی خود اپنی قربانی کے ہم معنی بن جائے۔ بہر حال تقویٰ ہر چیز کا بدل ہے۔

حدیث :-إنَّ اللهَ تعالى لَا ينظرُ إلى صُورِكُمْ وَأمْوالِكُمْ ، ولكنْ إنَّما ينظرُ إلى قلوبِكم وأعمالِكم اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے رنگوں کو نہیں دیکھتا لیکن وہ تمہارے قلوب اور تمہارے اعمال کو دیکھتے ہے (یعنی دل اور اعمال سے اشارہ نیت اور اخلاص کی طرف ہے)۔

اسلامی تعلیم اور مسلمان :- حق بات تو یہ ہے کہ حق کے داعی کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت آخرت کی ہوتی ہے وہ جہنم سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے اور جنت کا سب سے زیادہ مشتاق ہوتا ہے۔ علم سے زندگی کا شعور ملتا ہے آدمی کا عمل اس کی سوچ کا نتیجہ ہوتا ہے جتنا زیادہ سوچ گہری ہوگی اتنا ہی زیادہ گہرا نتیجہ نکلے گا۔ اور سوچ میں جتنی کمی ہوگی اتنا ہی عمل میں کمی ہوگی۔

اسلامی عقیدے کے مطابق، قرآن اُسی طرز زندگی کا ہدایت نامہ ہے جو خدا کی طرف سے انسان کیلئے بھیجا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو دین سارے کائنات کا دین ہے اُسی دین کو انسان بھی اختیار کرے۔ قرآن خدا کے وجود کی خبر دیتا ہے اور کائنات اپنے مظاہر کے سات تصدیق کرتی ہیں کہ یہ خبر صحیح ہے۔

علم سے زندگی کا شعور ملتا ہے اور اسلام کی بنیاد شعور پر قائم ہے۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے شعور کو زیادہ سے زیادہ بیدار کیا جائے کیونکہ شعوری بیداری پر اسلامی زندگی کی عمارت ہے۔

باشعور لوگ ہی اعلیٰ ایمان کا تجربہ کرتے ہیں۔ انکی عبادت ہی زندہ عبادت ہے باشعور لوگ ہی یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ وہ اسلام کے اصولوں پر اپنی زندگیوں کو ربّانی زندگی بنا سکیں۔ باشعور لوگ ہی اسلام کے اصولوں پر ایک حقیقی نظام بنا سکتے ہیں، باشعور افراد کے مجموعے کا نام ہی صالح معاشرہ ہے۔ اسلام، زندگی کی سائیس ہے۔ سائیس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ حقیقت پسند بن کر رہو۔ تعلیم ایک ایسا عمل ہے جو آدمی کی آخر عمر تک جاری رہتا ہے۔ Education is a lifelong process ۔عالم اسلام میں شرح خواندگی (literacy rate) نسبتاً کم ہے۔ جو لوگ پڑھے لکھے ہیں اُن کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا طبقہ ایسے افراد پر مشتمل ہے جنھوں نے مغربی طرز زندگی کے تعلیمی اداروں میں علم حاصل کیا اور صرف اور صرف دنیوی علوم پائے، یہ طبقہ تخلیق کائنات کے مقاصد کو سمجھنے اور مظاہر فطرت کو پیغام الٰہی کی روشنی میں دیکھنے سے قاصر ہے دوسرا طبقہ ایسا ہے جو دینی مدارس میں تعلیم پاتا ہے اور ان پر جدید علوم اور دنیوی علوم کے دروازے بند ہیں چنانچہ یہ لوگ اپنے زمانے کے نت نئے تقاضوں سے عُہدَہ بَرآ ہونے سے قاصر اور مجبور ہیں۔ ایک طبقہ دین سے نابلد ہے تو دوسرا دنیا سے ناواقف۔ یہ ایک بڑی غلطی ہے۔

تطبیق روحانیت کیا ہے؟ روحانیت کو عملی زندگی میں اپنانا، روحانی قدروں کو خارجی معاملات میں استعمال کرنا، روحانیت کا یہ پہلو کامیاب زندگی کی تعمیر کیلئے بے حد ضروری ہے۔ نفرت کے جواب میں خیر خواہی اور تشدد کے جواب میں امن، گویا روحانی قدروں کو عملی زندگی میں منتقل کرنا ہے، یہ کامیاب زندگی کا سب سے زیادہ یقینی فارمولا ہے۔ خدا کا پسندیدہ معاشرہ وہ ہے جس میں لوگوں کے باہمی تعلقات حسن ظن کی بنیاد پر قائم ہوں، دوسروں کے ساتھ بہتر سلوک کرنا ایک قسم کی عملی دعا ہے۔ ایسا آدمی گویا یہ کہہ رہا ہے کہ خدایا میں نے تیرے بندوں کے ساتھ بہتر معاملہ کیا تو بھی میرے ساتھ بہتر معاملہ دنیا اور آخرت ہیں فرما۔ مگر اسکے لئے صبر کی بے حد ضرورت ہے۔ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي ---- میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کیلئے ہے۔

﴿الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ﴾ [الملك: ٢]
اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے۔

سورۃ الملک مکّی صورت ہے۔ ۳۰ آیات اور دو رکوع پر مشتمل ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ہر صورت عذاب کو روکنے والی اور عذاب سے نجات دلانے والی ہے یہ اپنے پڑھنے والے کو عذاب قبر سے بچالیگی۔

خلاصہ: یعنی اللہ نے پیدا کیا موت اور حیات کو۔ یہاں پر احوال انسانی میں سے صرف دو چیزوں کو بیان کیا ہے۔ یعنی موت اور حیات اور یہی دونوں انسان کے تمام عمر کے احوال اور افعال پر حاوی ہیں۔ حیات ایک وجودی چیز ہے اس کا تعلق

تخلیق اور تکوین سے ہے۔ اور موت کا تعلق تخلیق سے اسطرح ہے کہ موت عدم محض کا نام نہیں ہے بلکہ روح اور بدن کا تعلق منقطع کر کے روح کو ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل کرنا ہے اسی لئے ایک وجودی چیز ہو گئی۔

آیت میں موت کا ذکر مقدم کر نیکی وجہ یہ ہے کہ اصل کے اعتبار سے موت ہی مقدم ہے کہ ہر چیز جو وجود میں آئی ہے وہ پہلے موت کے عالم یعنی (Non existence) کی حالت میں تھی پھر بعد میں اس کو حیات عطا ہوئی ہے اسلئے موت کو مقدم کیا ہے۔ موت اور حیات کی تخلیق کیوجہ انسان کی آزمائش اور امتحان ہے یہ آزمائش بہ نسبت حیات کے موت میں زیادہ ہے کہ اگر انسان موت کو پیش نظر رکھے اور اسکا استحضار ہر وقت رہے تو نیک اعمال زیادہ سے زیادہ کر سکیگا، کہ اسکی وجہ سے زندگی میں ہر قدم پر انسان کو اپنا عجز اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا استحضار بھی رہتا ہے جو حسن عمل کی طرف داعی ہے اس طرح موت کی فکر، اصلاح عمل اور حسن عمل میں سب سے زیادہ مؤثر ہے۔ حدیث: موت کی یاد انسان کو دنیا سے بیزار کرنے اور آخرت کی طرف رغبت دینے کیلئے کافی ہے۔

أَحْسَنُ عَمَلًا - یعنی اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ کون زیادہ عمل کرتا ہے اس سے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی عمل کی مقدار کا زیادہ ہونا قابل توجہ نہیں ہے بلکہ عمل کا اچھا ہونا اور صحیح اور مقبول ہونا معتبر ہے۔ یعنی مقصود الٰہی عمل کی کیفیت ہے نہ کہ کمیت۔ اسی لئے قیامت میں انسان کے اعمال کو گِنا نہیں جاتا بلکہ تولا جاتا ہے جس میں سے بعض ایک ہی عمل کا وزن ہزاروں اعمال سے بڑھ جائیگا۔ أَحْسَنُ عَمَلًا کی تشریح یہ ہے کہ

آدمی اللہ کی حرام کردہ چیزوں کے سب سے زیادہ پرہیز کرنے والا ہو اور اطاعت میں ہر وقت مستعد اور تیار رہے

خلاصہ : اگر آدمی اپنی موت کو یاد رکھے تو وہ کبھی سر کشی نہ کرے۔ اللہ کے رسول ﷺ موت کو روزانہ ۷۰ مرتبہ یاد کیا کرتے تھے اور روزانہ ۷۰ مرتبہ استغفار کیا کرتے تھے۔ موت کی یاد آدمی کو یہ سبق دیتی ہے کہ وہ اپنی حد میں رہنے کیلئے راضی ہو جائے۔ موت کی یاد میں موت کا وقت اور اسکے بعد کے مناظر کو بھی پیش نظر رکھے کہ کسطرح تن سے روح کشمکش کی حالت میں جدا ہوتی ہے۔ جانکنی (موت کے وقت آخری دم لینے کی کیفیت) کے وقت جانکنی میں سہولت کی خاطر بازو میں یٰسں شریف پڑھا جارہا ہے، کوئی کلمہ کی یاد دہانی دبی زبان سے کرا رہا ہے۔ اسکے بعد غسل کا منظر پھر کفن پوشی کا منظر، پھر گھر سے قبرستان لے جانے کا مایوس کن منظر، ہر طرف آہ و بکا، پھر قبر یعنی تقریباً "۵" فیٹ گڑھے میں اتارے جانے کا منظر، اُسکے بعد منکر و نکیر کے سوالات، کہ مَنْ رَبُّكَ ،مَا دِيْنُكَ، مَنْ رَسُوْلُكَ، وہ منظر بڑا ہی ہیبت ناک ہو گا۔ اللہ اس میں ہم سب کو کامیاب فرمائے آمین۔

جب دم واپسی ہو یا اللہ

لب پہ ہو لاَ إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

وہ پاک اور صاف جسم جس پر زندگی میں مچھر مکھی نہیں بیٹھ سکتے تھے اب کیڑوں، دیمک اور مکوڑوں کے حوالے ہے اُن کی عذر رہے، بتلایا گیا ہے کہ انسان کے جسم کے نرم حصے کو کیڑے ابتدا میں اپنی غذا بناتے ہیں جیسے پوپٹے، ہونٹ وغیرہ اسطرح ایک مدت کے بعد صرف ہڈیاں باقی رہ جاتی ہیں۔ نام کی تختی جس کا لگانا

منع تھا اب وہ بے کار ہو گئی کہ وہ نام ولا ہی نہ رہا۔ بعد تلقین سارے لوگ قبرستان سے مُردہ بیزاری کی کیفیت میں واپس ہو رہے ہیں۔ اشاروں میں چِہ می گوئِیاں (نوک جھونک) ہو رہی ہیں کوئی کہہ رہا ہے لینا جانتا تھا دینا نہیں جانتا تھا، کوئی کہہ رہا ہے ہاتھ دھوتے پھرتا تھا، کبھی کسی کا ہاتھ خود نہیں دھلایا، یہ اشارہ یہاں مہمان نوازی کی طرف تھا۔ کوئی کہہ رہا ہے بڑا مغرور تھا، کوئی کہہ رہا ہے زمین پر بوجھ تھا۔ (مذہب مرحوم کے بارے میں ایسی باتیں کرنے سے منع کرتا ہے ایسی صورت میں مغفرت کی دعا بہتر بات ہے۔)

انسان با وقار بننے کیلئے دنیا میں دنیا بھر کی کوشش کرتا رہا اور قبر میں بے وقار پہنچ گیا۔ دنیا کی تمام ترقیاں انسان کیلئے ایک فریبی روپ ہے۔ انسان زندگی میں غم غلط کرنے کی کوشش نہ کرے بلکہ اس کو صبر کے ساتھ برداشت کرے کیونکہ دنیا سارے انسانوں کے لیے عموماً غم کی جگہ ہے اور خصوصاً غریبوں کے حق میں تو غم ہے۔ غم کے ساتھ آزمائش کی جگہ دونوں کے حق میں ہے۔

غم دنیا، غم جاناں، غم منزل، غم راہ
کتنے غم زیست کے ہمراہ چلا کرتے ہیں

یاد ماضی، غم امروز، امید فردا
کتنے سائے مرے ہم راہ چلا کرتے ہیں

انسان جب موت کے کنارے کھڑے ہو جاتا ہے تو زندگی بے معنی، اُسکی رونقیں راکھ کا ڈھیر معلوم ہوتی ہیں جبکہ ساری زندگی انسان ان ہی رونقوں میں گم تھا،

آگے اس کے ایک ایسی دنیا ہے جس کیلئے تو وہ کچھ نہ کر سکا اور پیچھے ایک ایسی دنیا چھوڑ کر جاتا ہے جس کیلئے سب کچھ کھو چکا؟

زندگی کیلئے بہت کچھ کیا آدمی
آپ اپنے لئے کیا کیا آدمی

موت جس وقت سر پر ہو اسکو یاد کرنا بے فائدہ کیونکہ موت کا آنا، آناً فاناً ہے۔ موت صرف پانچ سیکنڈ کا نام ہے۔آدمی کی بے حیسی، بے شعوری اور موت سے تغافل، سکرات کے وقت تک ہے اور وہی شخص کامیاب ہے جو قبر والی زندگی کو تصور میں رکھ کر زندگی گزارے۔ دنیا ہوشیاری، اور دنیا بیداری میں تو انسانوں کے درمیان مسابقتی دوڑ ہے لیکن دین بیزاری بھی اسکے ساتھ ہے۔

پہنچے جو سر عرش تو نادار بہت تھے
دُنیا کی محبت میں گرفتار بہت تھے

غیر مؤمن یہ سمجھ کر زندگی گزارتا ہے کہ اسکو اسی دنیا میں جینا ہے اور مؤمن یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اسکو آخرت تک جانا ہے۔ اور اس زندگی کا حساب وہاں دینا ہے۔

دنیا ایک ایسا سٹیج ہے جسکو خدا کی طرف سے سجایا گیا ہے۔ سجاوٹ کی چیزیں کیا ہیں۔ مختلف قسم کے انسان، مختلف خیالات کے انسان، مختلف حالات کے درمیان مختلف طریقوں سے زندگی گزارنے والے انسان۔ یہی اختلافات سے اسٹیج کو سجا کر اللہ تعالیٰ ہر انسان کو موقع دیتا ہے کہ آیا وہ حق وانصاف پر رہتا ہے یا مجرمانہ زندگی گزارتا ہے۔ اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرتا ہے یا غلط۔

گناہ کیا ہے ؟اپنی آزادی کے غلط استعمال کی قیمت ہے۔ زندگی میں اصل مسئلہ چندہ روزہ عرصہ حیات کا نہیں ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ موت کے بعد کی زندگی کا ہے۔ موت کو آدمی بچپن اور جوانی میں بھولا دیتا ہے لیکن بڑھاپے میں ضعف کی وجہ سے موت کے قریب ہونے کا احساس غالب ہوتا ہے۔ سفر موت کا ہے اسکو زندگی کا سفر کہنا غلط ہے۔ انسانی دنیوی زندگی زیادہ سے زیادہ ۱۰۰ سال کی ہے۔ ملازم سرکار سے پوچھا گیا کہ آپ ملازم سرکار ہیں، نوکری چل رہی ہے پھر طب یونانی کیوں سیکھ رہے ہیں تو جواب ملا کہ ٦٠ کے بعد کی زندگی کا انتظام ہے۔

اسی بات کو اگر توسیع دیگئی تو مؤمن اسلئے عمل کرتا ہے تاکہ آئندہ ہمیشگی کی زندگی میں کام آئے۔ اس طرح خدا کا دین ہم سے ہماری زندگی مانگ رہا ہے۔

گھر کا کوئی آدمی مرتا ہے تو گھر والے نماز پڑھنا شروع کرتے ہیں، قرآن خوانی بھی ہوتی ہے دین دارانہ صورت، شکل اور کپڑے پہننا بھی شروع کر دیتے ہیں یہ عمل کہیں ایک ماہ تو کہیں ۱۵ دن چلتا ہے پھر جیسے تھے ویسے۔ یہہ بے حسی کا نتیجہ ہے۔

موت کیا ہے ؟ آخرت میں جبراً داخلہ کا نام موت ہے اور دنیا کا نام اخروی سفر کا راستہ ہے۔

اپنی مرضی سے مرتا نہیں آدمی
آدمی جان دینے پر مجبور ہے

مرنے کے بعد غسل اور نیا کپڑا پہنایا جاتا ہے اور اسکے لئے دعاء مغفرت بصورت نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ مردہ اور مٹھی حالانکہ دونوں مساوی ہے لیکن مردے کے ساتھ مٹھی جیسا سلوک کرنیکے بجائے انسان جیسا سلوک کیا جاتا ہے یہ زندہ

لوگوں کے اعتبار سے ہے کہ وہ لوگ خود کو مرنے والے کے روپ میں دیکھیں اور موت سے پہلے موت کا تجربہ کر لیں۔ اسکی ایک مُمثل شکل حاجی کے روپ میں، احرام کے دو کپڑے بھی ہیں۔

کور غریباں (قبرستان جہاں اجنبی، مسافر یا غریب لوگ دفن کیے جاتے ہیں) کی حالت دیکھیں کہ کس قدر ویرانی کا عالم ہے آدمی وہاں جانے سے دن میں بھی ڈرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں قیامت تک برزخی زندگی گزارنا پڑتا ہے اور جو کچھ اعمال کے بارے میں فیصلہ الٰہی ہو جاتا ہے اسکے مطابق عذاب قبر دیا جاتا ہے۔ قبر کا نام و نشان بھی چند سالوں میں ختم ہو جاتا ہے۔

خوف آخرت : - لوگوں کے درمیان خوف آخرت کا نہ ہونا کوئی سادہ بات نہیں ہے یہ اس بات کی علامت ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اللہ کا خوف نہیں۔

ایک مثال : اگر ایسا ہو کہ لوگوں کے درمیان ایک کالا سانپ نکل آئے تو ہر شخص اجتماعی طور پر ایک ہی آواز لگائیگا کہ سانپ سے بچو۔ اسی طرح سے اگر لوگوں کے اندر آخرت کا خوف ہو تو حساب و کتاب کا یقین سزا اور جزا کا استحضار رہے تو حقیقی طور پر اتحاد عمل میں آ سکتا ہے۔ اسکے لئے اتحاد کانفرنس یا بھائی برادری کیلئے وعظ اور تقریر کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اور اس سے فائدہ بھی نہیں ہوتا۔ اسلئے اتحاد کی ابتدا شعوری بیداری سے ہونا چاہیے، آخرت بیداری سے ہونا چاہیے۔

خوف خدا اور فکر آخرت کی باریکیوں کو بیان کرنا مہارت دین ہے۔ اگر قوم کے اندر صحیح ایمانی حالت ہے تو اسکے اندر حقیقت پسندی کا مزاج ہوتا ہے اور اگر قوم حالت مرض میں ہے تو جھوٹی تمناؤں اور خوش خیالیوں کی راہ پر چلنے لگتی ہے۔

لوگ دین کا جزوی کام کر کے اسکو کلّی سمجھ رہے ہیں۔ اسطرح زیادہ نقصان کے قابل کم نقصان کو گوارا کر لیں، حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں دو قسم کی پکار چل رہی ہے ایک دنیا کی پکار اور دوسری آخرت کی پکار۔ صاحب دنیا سے صاحب آخرت میں جانا ضروری ہے۔

زندگی بعد الموت کا سوال محض ایک فلسفیانہ نہیں ہے بلکہ ہماری عملی زندگی سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔ دراصل ہمارے اخلاقی رویہ کا سارا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ میرا اعتقاد زندگی بعد الموت کے بارے میں کس قسم کا ہے؟ اگر میرا اعتقاد یہ ہے کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی ہے اور اس دنیوی زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے تو میرا اخلاقی رویہ اور طرز زندگی ایک طرح کی ہو گی اور اگر میرا اعتقاد اس سے برعکس ہو یعنی یہ کہ موجودہ دنیوی زندگی کا حساب وکتاب دینا ہو گا تو میرا اخلاقی طرز عمل اس دنیا میں بالکل دوسری طرز کا ہو گا۔ پہلے شخص کی نظر صرف ان نتائج پر ہو گی جو اس دنیا میں مرتب ہوتے ہیں اور دوسرے شخص کی نظر میں وہ نتائج ہوتے ہیں جو آخرت میں مرتب ہونگے۔ چنانچہ عمل کے میدان میں قدم کس طرف اُٹھانا ہے اسکے تعین کیلئے یہ عقیدہ آخرت فیصلہ کن اثر رکھتا ہے۔

<u>عقلی استدلال</u> پر ہمارے سامنے ایک طرف کائنات ہے اور اُس کے مقابل انسان ہے۔اس کائنات میں دو قانون ہیں ایک طبعی قوانین (physical law) اور اخلاقی قوانین ہیں یعنی (Moral law)۔ طبعی قانون کا تعلق تو ساری مخلوق سے ہے لیکن اخلاقی قوانین کا تعلق اشرف المخلوقات یعنی انسان ہی سے ہے۔ کیونکہ اس کائنات میں کوئی دوسری ایسی مخلوق نہیں ہے جو اخلاقی وجود رکھتی ہے یا جسکو اخلاق کی

ضرورت ہے یا اخلاق کی پابند ہے کیونکہ انسان کے اندر ہی نیک اور بد کا شعور ہے اچھے برے کی تمیز ہے۔ ظلم اور انصاف ، حق و ناحق، سچ اور جھوٹ وغیرہ اخلاقی صفات کے درمیان فرق کر سکتا ہے۔

اس لحاظ سے اسکی فطرت کا تقاضہ ہے کہ جس طرح اضافی افعال کے طبیعی نتائج رونما ہوتے ہیں اسی لحاظ سے اور اسی طرح سے اخلاقی نتائج بھی رونما ہوں۔ لیکن یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتا ہے کہ انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح اس کائنات میں رونما نہیں ہو سکتے۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ انسان طبعی قوانین ہی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ کیونکہ اسکے فوری نتائج عملی طور پر سامنے آتے ہیں۔ جیسے کوئی شخص دوسرے کو پتھر سے مارا، اسکے مار کی چوٹ زخم کی صورت میں اور تکلیف کی صورت میں فوراً ظاہر ہو جاتے ہیں لیکن ایک شخص اگر دوسرے کو گالی دے تو اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا حالانکہ اس سے بھی تکلیف ہوتی ہے اسکا اندرونی اثر احساس کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کائنات میں مادی عناصر کیلئے قوانین مقرر ہے لیکن اخلاقی عناصر کیلئے کوئی قانون مقرر نہیں ہے کہ اس سے مقررہ نتائج نکلیں۔ اسطرح طبیعی قوانین اس دنیا میں غالب ہونیکی وجہ سے اخلاقی نتائج کبھی تو نکل ہی نہیں سکتے جیسے ایک شخص دشمنی کی بناء پر دوسرے شخص کا گھر جلا ڈالا۔ گھر کا جل جانا، انسانی فعل کا طبعی نتیجہ ہے۔ اب اس کا اخلاقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ اس شخص کو اتنی ہی سزا ملے جتنا وہ ایک خاندان کو جانی اور مالی نقصان پہنچایا ہے یعنی جس قدر سنگینی جرم کی ہے اسی قدر سنگینی سزا کے اعتبار سے ہونی چاہیے۔ اور اسکو سزا ملنی چاہیے۔ کہ جب جرم میں تاخیر نہیں ہوئی تو سزا میں تعطل (تعظیم) نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اس دنیا میں وہاں تک پہنچنے کیلئے بہت سی باتیں طے کرنی پڑتی ہیں

یعنی آگ لگانے والا کون تھا، پھر اس کا جرم ثابت ہو، عدالت اسکے نقصان کا پورا اندازہ کرے پھر انصاف سے اس مجرم کو سزا ملے۔ اگر ان شرائط میں سے کوئی بھی شرط پوری نہ ہوئی تو اس طبیعی نقصان کا اخلاقی نتیجہ یا تو بالکل ظاہر ہی نہ ہو گا یا تھوڑا سا ظاہر ہو گا۔ یا یوں بھی ممکن ہے کہ وہ شخص اپنے دشمن کا نقصان کر کے بغیر کسی سزا کے دنیا میں رہے۔ بہر حال انصاف کا ملنا ایسی دنیا میں محال ہے۔

مزید ایک مثال جیسے کہ چند لوگ اپنے قبیلہ میں اَثَر و رُسُوخ (influence) پیدا کر لیتے ہیں اور ساری قوم ان کے کہنے پر چلتی۔ اس پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر وہ لوگوں میں قوم پرستی اور اشتعال انگیزی (جوش دلانے والا) کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ پڑوسی قوم سے جنگ چھیڑتے ہیں پھر ہزاروں آدمیوں کا دونوں طرف سے جانی اور مالی نقصان ہوتا ہے پھر نسل در نسل پستی میں زندگی گزارنا پڑتا ہے۔ جو اشخاص اقتدار کی بناء پر اس نقصان کے کلیدی مجرم ہیں کیا انکو انکے جرم کے مطابق سزا اس دنیا میں ملتی ہے؟ جواب نفی میں ملیگا۔

اگر ان کے جرم کی شدت کو محسوس کریں تو ان کی سزا جیسی ہونی چاہیے ویسی نہیں ملتی کیونکہ اس دنیا میں وزن روپیہ میں ہے، سچائی میں وزن نہیں ہے۔ بہر حال موجودہ نظام کائنات جن طبعی قوانین پر چل رہا ہے اُن کے تحت کسی طرح بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے جرم کی سزا پا سکے۔ اس دنیا میں جو آدمی نیک ہے جو اپنی پوری زندگی شب و روز ایک کر کے نوع انسانی کو حق پرستی کی تعلیم دیتا ہے اور اُسکی محنت کے اثرات اس قدر دور اندیش ہوتے ہیں کہ بے شمار انسانی نسلیں صدیوں تک حق پر زندگی گزارتی ہیں جو حضرت ایسی محنت اس دنیا میں کرتے ہیں

کیا انکو انکی خدمات کا صلہ اس دنیا میں ملیگا۔ جبکہ خود انسان کی زندگی ۷۰ - ۸۰ سال ہے اور ایسے کاموں کی جزا بے انتہاء ہوتی ہے۔

اسطرح عقلی دلائل سے بھی یہ ثابت ہوتی ہے کہ موجودہ طبعی دنیا اور اسکے طبعی قوانین حیوانی عناصر کیلئے ہیں مگر اسکے اخلاقی عنصر کیلئے یہ دنیا ناکافی ہے اسکے لئے دوسرا انظام عالم درکار ہے۔ جس میں غالب اور حکمران قانون، اخلاقی قانون ہوا اور طبیعی قوانین اسکے تحت ہوں یعنی اسکے مددگار ہوں اور غیر محدود زندگی ہو، تاکہ اخلاقی نتائج جو اس زندگی میں مرتب نہ ہو سکیں وہ وہاں مرتب ہوں۔ عیش وآرام اُس کو ملے جو نیک ہوں اور سزا اسکو ملے جو بد ہوئے۔ جزا کی صورت میں جنت ہو اور سزا کی صورت میں دوزخ ہو۔

مخلص کو جزا ملے اور مجرم کو سرا ملے۔ اسطرح عقلی استدلال یہ چاہتا ہے کہ ایسا ایک اخلاقی نظام عالم ہونا چاہیے۔ اب یہ سوال کہ ایسا کوئی اخلاقی نظام کہیں موجود ہے؟ اس کے جواب میں عقل اور ہمارا محدود علم دونوں عاجز ہیں ایسے وقت میں قرآن ہماری رہنمائی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہاری عقل اور تمہارا علم دونوں عاجز ہیں۔ تمہاری فطرت جس نظام کو چاہتی ہے وہ نظام قائم ہونے والا ہے لیکن اُس سے قبل اس موجودہ نظام کو توڑ دیا جائے ہے گا جس میں طبیعی قوانین چلتے ہیں۔

پھر ساری مخلوق کو دوبارہ زندہ کیا جائیگا ایک جگہ جمع کیا جائیگا پھر دنیا کے ہر عمل اور ردعمل کی روداد پیش کی جائیگی مظلوم اور ظالم، محکوم اور حاکم، مغلوب اور غالب، کمزور اور طاقتور، سب ایک دوسرے کے روبرو ہونگے، انسان کے اعضاء وجوارح گواہی دینگے، نیکیوں کا بھرپور صلہ ملیگا۔ موت، بیماری، بڑھاپا اس بدلے میں آڑ نہ

آئے گا۔ عیش میں کوئی چیز خلل نہ ڈال سکیگی۔ اسطرح برائی کے اثرات جو اس دنیا میں ابتداء کائنات سے چلتے رہے اور بے شمار انسانوں میں نسل در نسل پھیلتے رہے ان سب کے محرکین اور مجرمین کو پوری پوری سزائیں دی جائینگی نہ موت آڑ آئیگی اور نہ بیہوشی یا مدہوشی۔

ایمان بالغیب: موجودہ کائنات میں طبعی قوانین کا وجود خود اسبات کی دلیل ہے کہ ایک ایسا نظام بھی اس کی طرف سے وجود میں آئیگا جسکی طرف سے یہ نظام کائنات قائم ہے جہاں اخلاقی قوانین کا چلن ہوگا۔ اس بات کو ماننے کیلئے علم غیب نہیں ایمان بالغیب چاہیے۔ اس دنیا میں یقین آخرت ہی اعمال صالحہ کے صدور کیلئے بہترین محرک ہے۔ ذہن کی اصلاح عمل کی اصلاح ہے اور ذہن کی تعمیر، زندگی کی تعمیر ہے۔ آدمی جس قدر سنجیدہ ہوگا اسی قدر اسکے اندر صحت فکر کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ اللہ کا ڈر آدمی کو سب سے زیادہ سنجیدہ کر دیتا ہے۔

صحیح طرز فکر یا عمل تفکیر

سب سے پہلے یہ جانیں کہ سوچنے کا درست طریقہ کیا ہے؟ کیونکہ کسی معاملہ میں صحیح نقطہ نظر تک پہنچنے کیلئے یہ اہم شرط ہے۔ انسان علم قلیل کے ساتھ نوازا گیا ہے فطرت کے نظام کے مطابق وہ جن باتوں کو جان سکتا ہے ان کو جاننے کی کوشش کرے اور جن کو اپنی محدودیت کی بناء پر نہیں جان سکتا ان کے بارے میں وہ اجمالی علم پر قناعت کرے (ابھموا ما ابھمہ اللہ یعنی جس چیز کو خدا تعالیٰ نے مبہم رکھا ہو تم بھی مبہم رکھو) ایسی صورت میں آدمی گڈ مڈ اور الجھن سے بچ سکتا ہے اور صحیح نتیجہ فکر تک پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے۔ صحیح رائے تک پہنچنے میں ظاہری سطح

سے حقیقی اندرونی سطح تک پہنچ اُسکے لئے گہرا تجزیہ کرے۔ قرآن ایک نظریاتی کتاب ہے اسکو سمجھنے کیلئے ذہنی استعداد کی ضرورت ہے نہ کہ فنّی استعداد کی۔ آدمی منتشر ذہن اور درست ذہن کے فرق کو جان لے۔

فنّ تفکیر :- (۱) سوچنے کا عمل، ذہن کی سطح پر ہوتا ہے اور انسانی وجود میں سب سے بڑی چیز یہی ذہن ہے۔ (۲) سوچنے کا عمل، ذہنی ارتقاء کا ذریعہ ہے تمام بڑی باتیں سوچنے کے ذریعے ہی سے دریافت ہوتی ہیں۔ (۳) سوچنے سے آدمی حیوانی سطح سے اُٹھکر انسانیت کی اعلیٰ سطح تک پہنچتا ہے۔ سوچنے ہی سے ایک چیز اور دوسری چیز سے فرق معلوم ہوتا ہے۔ سوچنے سے پوشیدہ حقیقت انسان کے علم میں آتی ہے۔ سوچنے ہی سے انسان اپنے عملی کی منصوبہ بندی کر سکتا ہے۔ صحیح طرز فکر کیلئے آدمی اپنی پسند اور ناپسند سے اوپر اٹھکر سوچنے کا حوصلہ رکھے وہ چیزوں کو ایسا ہی دیکھے جیسے وہ ہیں یا انکی حقیقت ہے نہ کہ ویسا دیکھیں جیسے وہ خود انکو دیکھنا چاہتے ہیں پھر سوچ کے نتیجے کو ہر حال میں قبول کرنے کیلئے تیار ہو خواہ اسکے موافق ہو یا اسکے مخالف۔ صرف کسی چیز کے بارے سے معلومات اس چیز کی حقیقت کو جاننے کیلئے کافی نہیں ہیں ظاہری علم کے ساتھ معرفت ہو تو اس چیز کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے وہ سطور کیساتھ بین السطور کو پڑھتا ہے۔ ذہنی پریشانیوں کے مسئلے کا حل اس کو ختم کرنا نہیں ہے بلکہ اسکو سلجھانا ہے اور فکری تدبیر کے ذریعے اسکو غیر موخر کر دینا ہے۔ کہ وہ عملاً تو انسان کیلئے پیش آئے مگر وہ انسان کے ذہنی سکون کو برہم نہ کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز کا انحصار سوچنے پر ہے۔ اگر سوچنے کا طریقہ صحیح ہو تو ذہن ایک ڈھنگ سے بنیگا۔ اور اگر دوسرے ڈھنگ سے سوچے تو دوسرے طریقے سے ذہن بنیگا۔ اسطرح ہر مایوسی کو اعتماد میں بدلا

جاسکتا ہے اور ہر پست ہمتی کو بلند ہمتی ہیں اور جس چیز کو اصولی طور پر حاصل کرنا ناممکن ہو اسکو عملی طور پر حاصل کرلینا چاہیے۔ جب دو فریقوں کے درمیان نزاع ہو تو ہر فریق کی سوچ یکطرفہ رخ پر چلتی ہے۔ ہر فریق دوسرے فریق کی زیادتیوں کو یاد کرتا ہے اور بیان کرتا ہے اس طرز فکر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوچ غیر متوازن اس اعتبار سے ہو جاتی ہے کہ ہر فریق اپنے حصّے کی زیادتی کو بھولا کر صرف دوسرے فریق کی زیادتی کو یاد رکھے سوچ کا یہ طریقہ ہمیشہ تباہ کن ہے۔ متوازن طرز فکر ہمیشہ ترقی کی طرف لے جاتی ہے۔ آدمی گذشتہ کی ناخوشگواروں کو بھول جائے اور چھوٹے مسئلہ کو بڑا مسئلہ نہ بنائے۔ خوش عقیدگی الگ بات ہے اور حقیقی دلیل الگ بات ہے۔ فکری معیار کا فرق ایک دوسرے کے درمیاں ہوتا ہے یہ بھی اختلاف کا ذریعہ ہے۔ علمی معیار میں تحلیل اور تجزیہ کا طریقہ رائج ہے۔ اسلام سچا ہے یہ بات صحیح ہے لیکن میں بھی سچا ہوں یہ فیصلہ آخرت میں ہوگا۔

مذہب اسلام اور دیگر مذاہب

دنیا میں ایک درجن بڑے مذاہب ہیں اور چھوٹے مذاہب کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے۔ آپسی اتحاد کیلئے یہ ضروری ہے کہ آدمی ایک مذہب پر رہتے ہوئے دیگر مذاہب کا چونکہ اعتراف نہیں کرسکتا اسلئے احترام کرے یعنی ایک کی پیروی اور سب کا احترام۔ لوگ اپنی کم صحیح یا غلط بات کو صحیح ثابت کرنیکے لئے فرضی مثالیں دیا کرتے ہیں۔ تمثیل کا طریقہ استدلال سب سے کمزور طریقہ ہے کیونکہ علمی تجزیہ تمثیلی استدلال کو غلط ثابت کرتا ہے۔ ایک مثال، جیسے کہا جاتا ہے کہ ہر مذہب یکساں طور پر سب کو خدا تک پہنچانیوالا ہے جیسے کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایک عمارت ہو

توکسی طرف سے بھی پہاڑ پر چڑھیں عمارت تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہر مذہب سچا ہے یہ ایک غیر علمی اور غیر منطقی نظریہ ہے کیونکہ ان کے درمیان بنیادی اختلافات ہیں۔ کسی کے نزدیک خدا ایک ہے کسی کے نزدیک متعدد خدا ہیں، کوئی پرسنل گاڈ میں یقین رکھتا ہے کوئی پیغمبر کو مانتا ہے اور کوئی خدا کے پیغمبر میں حلول کر جانے کو مانتا ہے، کوئی تثلیث کا عقیدہ رکھتا ہے کوئی ابنیت کا، کوئی نجات کو اپنی محنت کا نتیجہ قرار دیتا ہے، تو کوئی خدا کے بیٹے کو سولی پر چڑھ جانے کو اپنے لئے نجات کا ذریعہ سمجھ بیٹھا۔

چنانچہ مذاہب کے درمیان بنیادی قسم کے اختلافات موجود ہیں۔ ایسی صورت میں ہر مذہب کو یکساں مذہب بنانا ایک ایسا دعوی ہے جس کے لئے کوئی علمی اور منطقی بنیاد موجود نہیں ہے۔ مذہب کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کو یقین اور اعتماد بخشے اور اسکے لئے جینے کا ایک غیر متزلزل سہارا ہو تو بحران کے لمحات میں اسکے لئے بھروسا بن سکے۔ یہ مقصد صرف ایک سچائی کے تصور سے پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ آدمی کسی ایک سچائی پر اپنے ذہن کو مرتکز کر سکتا ہے نہ کے کئی سچائیوں پر، ہر مذہب والا اپنے مذہب کو دیگر مذاہب سے افضل ثابت کرتا ہے اور اپنے کو خدا کے یہاں سب سے افضل مقام کا پانے والا سمجھتا ہے اس قسم کا عقیدہ بے بنیاد ہے۔

مذاہب کے درمیان جو تقسیم ہے وہ صرف محفوظ اور غیر محفوظ اعتبار سے ہے کہ افضل اور غیر افضل ہونیکے اعتبار سے۔ ہندوستان کے ایک ہندو مفکر نے کہا کہ ہندوؤں کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کا مذہب اتنا زیادہ غیر عقلی ہے کہ وہ ان کیلئے کھڑے ہونیکی مثبت بنیاد نہیں بن سکتا وہ صرف مسلم دشمنی کی منفی بنیاد پر کھڑے ہو سکتے

ہیں۔ سوائے اسلام کے تمام مذہب تحریف کے نتیجے میں غیر عقلی ہو گئے ہیں کہ ان کا قومی مذہب ان کیلئے قابل عمل نہیں ہے۔ اسلام قابل عمل ہے لیکن قومی تعصب کی بناء پر اس کو اختیار نہیں کرتے۔ اسلام ایک الہامی مذہب ہے اور یہ سماجی حالات کی پیداوار نہیں ہے۔ کہ اس کا مطالعہ سماجی مذہب کے اعتبار سے کیا جائے۔

موجودہ زمانے میں اسلام میں اصلاح کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسلام میں مسلمانوں کی طرف سے جو اضافے کئے گئے ہیں اُن سے اسلام کو پاک کرنا ہے اسکے برعکس دیگر مذاہب میں غیر فطری اور غیر عقلی تعلیم داخل کر دی گئی ہے۔ اس پر بھی لوگ سوائے اسلام کے دیگر مذہب پر اسلئے قائم ہیں کہ وہ ان کو ایک روایتی ضمیمہ کے طور پر لئے ہوئے ہیں۔ اگر وہ اپنے مذہب پر اپنی عقل کو استعمال کریں تو شاید کوئی بھی مذہب قابل اخذ اور قابل عمل نہیں ہے۔ دنیاں میں ایک درجن بڑے بڑے مذاہب ہیں لیکن ان کے تعلیمات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اس لئے لوگ یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ مذہب ایک شخصی معاملہ ہے کہ جو شخص جس مذہبی عقیدے کو مانے وہی اُس کا مذہب ہے اور کسی دوسرے شخص کو اسکے شخصی معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس قسم کا مذہبی تصوّر صحیح نہیں ہے۔ مذہب اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ہے جو ایک مکمل آئیڈیالوجی

Ideology کا نام ہے جو انسان اور کائنات کی اطمینان بخش توجیہ کر سکے اور ایسے نظریات جن میں انسان اپنے تمام داخلی اور خارجی سوالات کا جواب پائے۔ مذہب آدمی کیلئے یقین کا سرچشمہ ہے۔ جو مذہب کلّی صداقت پر نہ ہو وہ انسان کو یقین کا سرمایہ نہیں دے سکتا اور جو ایسا نہ کر سکے وہ مذہب ہی نہیں ہے۔ ہر موجودہ مذہب کو مستند سمجھنا غلط بات ہے کیونکہ خالص علمی اعتبار سے تمام مذاہب کی حیثیت

یکساں نہیں ہے۔ کچھ مذہب ایسے ہیں جن کا کوئی تاریخی پس منظر نہیں ہے۔ ایسے مذاہب ابتدائی مرحلے ہی میں رد ہو جاتے ہیں کیونکہ جب مذاہب کو تاریخی اعتباریت (Historical Credibility) حاصل نہ ہو وہ سرے سے اس قابل نہیں تھا کہ اسکو قبول کیا جائے۔ کچھ ایسے مذاہب ہیں جن کے بارے میں یہ ثابت نہیں ہے کہ ان کا موجودہ متن (Text) کسی بھی تبدیلی کے بغیر اصلی حالت میں موجود ہے۔ اور جس مذہب کا متن خود مشتبہ ہو اُسکی صداقت پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے۔ اور جس مذہب میں محرک (Motivator) ناقص ہو وہ بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے مختلف علمی معیار ہیں کہ جب ان معیاروں پر موجودہ مذاہب کو منطبق کیا جاتا ہے یہ مذاہب علمی جانچ پر پورے نہیں اترتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مذہب اور دنیوی معاملات میں تعلقات کی نوعیت اگر نا قابل عمل ہو تو وہ مذہب بھی ناقص ہے اور ایسے مذاہب کتب خانے کی زینت ہو سکتے ہیں۔

اسلام اور علمی معیار: اسلام ہی میں وہ خصوصیت ہے جو ہر علمی معیار اور جانچ پر پورا کرتا ہے۔ اسلام میں مستند ماخذ ہے جس کے ذریعے مذہبی عقائد کا ایک غیر اختلافی نظام بنایا جا سکے۔ یقین وہ سب سے بڑی چیز ہے جس کے لئے انسان کو مذہب کی ضرورت ہے۔ اگر تمام مذاہب کو یکساں مانیں تو انسان یقین سے محروم ہو جاتا ہے کیونکہ یقین کا تعلق صداقت سے ہے اور صدر رفت سارے مذاہب میں نہیں ہے۔

اسلام اور دنیوی معاملات میں تعلقات کی نوعیت یہ ہے کہ جو چیز انسانیت کیلئے مفید ہو وہی مذہب کے نزدیک بھی درست مانی جاتی ہے لیکن مذہب عیسائیت میں دنیا داری، دین کا ایک جز ہے۔ چنانچہ ایسی دنیا داری لوگوں کیلئے نا قابل قبول ہو گئی

چنانچہ چرچ (Church) اور ریاست دونوں میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ اسی طرح مذہب اور سیاسی اقتدار کا معاملہ ہے۔

اسلام کا متن ،اور اسلام کی تاریخ، اسلام کی تعلیمات حتیٰ کہ اسکے متن کی اصلی زبان بھی آج پوری طرح ابتدا کی حالت میں موجود ہے۔اسطرح اسلام قابل یقین مذہبی نظام بھی دیتا ہے اور دیگر چیزیں بھی جو مذہبی تشکیل کیلئے ضروری ہیں۔ قرآن، فلکیات، طبعیات، حیاتیات، ارضیات، نباتات، حیوانات اور تاریخ وغیرہ کے بارے میں ایسے بیانات ملتے ہیں جو ۱۵۰۰سال قبل کسی بھی انسان کو معلوم نہیں تھے۔ جبکہ قرآن نازل ہوا (۶۱۰-۶۳۲)۔ یہ سارے حقائق بعد میں ۱۹ویں صدی اور بیسویں صدی میں انسانی علم میں آئے۔ان حوالوں کا آج بھی قرآن میں موجود ہونا اسبات کا قطعی ثبوت ہے کہ قرآن خداوند عالم الغیب کا کلام ہے اور اسی قرآن اور رسالت پر مذہب اسلام کی بنیاد ہے۔

علم اور معرفت کا فرق: علم کا مطلب ہے جاننا اور معرفت کا مطلب ہے پہچاننا، علم معرفت کیلئے روشنی ہے۔ چنانچہ آنکھ اور روشنی میں جو نسبت ہے وہی نسبت علم اور معرفت میں ہے۔اگر روشنی بالکل نہ ہو تو کچھ بھی نظر نہ آئیگا اگر روشنی موجود ہو مگر وہ کم ہو تو اُس کے بقدر نظر آئیگا۔اس طرح معرفت حاصل ہونے اور نہ ہونے میں ہزار درجے ہیں۔

<u>ایک مثال</u>:- کیڑے مکوڑے کثرت سے انڈے، بچے دیتے ہیں اور ان کے اندر نمو کی غیر معمولی صلاحیت بھی ہوتی ہے کہتے ہیں کہ اگر بھیڑ (ڈکوری) کو مسلسل زندہ رہنے اور نشور نما پانے کا موقع ملے تو وہ شیر کی جسامت تک حاصل کر سکتی ہے۔

اگر غور کریں تو پتہ چلیگا کہ اگر ہزاروں قسم کے کیڑے اسطرح چلنا پھرنا شروع کریں تو انسانی زندگی مشکل ہو جاتی ہے اسلئے اللہ نے ایسا انتظام کیا ہے کہ ان کیڑوں میں سانس کی نالیاں، انسان کی نالیوں کی طرح نہیں ہوتیں بلکہ ان کی سانس کی نامیاں ان کے بڑھتے ہوئے جسم کے اعتبار سے نہیں بڑھتی بلکہ جیسا جیسا جسم بڑھتا ہے وہ نالیاں تنگ ہوتی چلی جاتی ہیں پھر ایک حد پر سانس روک کر وہ مر جاتی ہیں۔

عالم قدرت اور عالم فطرت کا یہ نظم و نسق اور یہ حکمت عملی ہم کو یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ اس کائنات کے پیچھے کوئی اعلیٰ ذہن کام کر رہا ہے یعنی ایک لا محدود عقل ہی مستقبل کے انتظام کو پیشگی تصور میں لا سکتی ہے۔ یہ معرفت والا ذہن ہے جو اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔

ISLAHI TOHFA

مقصد کے بغیر علم صرف معلومات ہے مگر علم جب مقصد کے ساتھ ہو تو وہ معرفت بن جاتا ہے۔ کیونکہ مقصد ہی لوگوں کے اندر وہ اعلیٰ فکر اور اعلیٰ کردار پیدا کرتا ہے جس کے ذریعے وہ کسی ذمہ داری کو پورا کر سکتا ہے اور مقصد کیلئے اعلی قربانی کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ حدیث: معرفت میری اصل پونجی ہے۔

معرفت کی ابتداء نفس انسانی کی شناخت سے ہوتی ہے۔ علم کا درجہ معرفت سے بڑھ کر ہے۔ معرفت سے موزونیت الٰہی نصیب ہوتی ہے۔ معرفت سے ہیبت پیدا ہوتی ہے اور اسی سے آگے کے منازل ہیں۔ عارف کی اصطلاح میں معرفت کو ہدایت بھی کہتے ہیں۔

عقل دین کی بنیاد ہے اور عقل کی بنیاد علم ہے اور علم کی بنیاد صبر ہے۔ مذہب معرفت خداوند کا نام ہے۔ جس نے دنیا کو جس قدر پہچانا اسی قدر اس سے بے رغبت ہوا۔ اس دنیا میں سب سے زیادہ قیمت علم کی ہے اسی طرح آخرت میں سب سے زیادہ قیمت معرفت کی ہو گی۔ جو شخص معرفت خداوندی میں جس قدر بلند ہو گا اسی قدر وہ آخرت میں بلند کیا جائیگا۔ معرفت اس دنیا کا سب سے بڑا عمل ہے۔ اور اللہ کی معرفت کا نہایت گہرا تعلق علم سے ہے۔ جس قدر زیادہ علم اسی قدر زیادہ معرفت پھر اسی قدر اعلیٰ ایمان حاصل ہوں گا۔

تمیزِ خار و گُل سے آشکارا
نسیمِ صُبح کی رَوشن ضمیری
حفاظت پھُول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خُوئے حریری

اقبال

اقبال کا کہنا ہے کہ نسیم سحری (صبح کے وقت چلنے والی باد صبا) نہ تو ذی شعور ہے اور نہ صاحب ادراک ہے اسکے باوجود وہ کانٹے اور پھول میں تمیز کرتی ہے اس لئے ثابت ہوا کہ وہ کسی ذی شعور اور صاحب ادراک کے تحت کار فرما ہے۔ وہ کسی حکیم اور علیم اور قادر مطلق ہستی کے تابع ہے اسی وجہ سے نسیم سحری، پھولوں کو شگفتہ کرتی ہے اور کانٹوں کی سختی کو قائم رکھتی ہے۔

اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں ہر چیز اپنی ذات کے تقاضے کے مطابق ترقی کرتی ہے۔ پھول اور کانٹا دونوں ایک ہی شاخ پر لگتے ہیں لیکن کانٹے میں خوشبو

اور نرمی پیدا نہیں ہوتی اور پھول میں سختی نہیں آسکتی کیونکہ مادہ تو ادراک سے اور شعور سے خالی ہے اس سے ثابت ہوا کہ اسکے پیچھے کوئی علیم اور حاکم ہستی کارفرما ہے اگر کوئی کہے کہ قانون انتخاب طبیعی کے مطابق (یعنی physical law) کے مطابق سیب کا درخت جڑوں کے ذریعے وہی ذرات جذب کریگا جن سے سیب بن سکتا ہے اور ناریل کا درخت وہی ذرات جذب کر دیگا جس سے ناریل بنے یعنی سیب کیلئے شیرینی ضروری ہے اور ناریل کیلئے نمکین۔ یہ ادراک جڑوں میں کیسے آگیا۔ اگر یہ عمل بھی کسی قانون کے تحت رو یہ عمل آرہا ہے تو قانون کا وجود کسی قانون ساز کے وجود پر دلالت کرتا ہے کیونکہ قانون خود جڑیں نہیں بنا سکتیں۔ قانون کا بنانے والا ذی شعور اور صاحب ادراک ہونا ضروری ہے اور مادے میں یہ سب تو نہیں ہوتا، اس سے پتہ چلا کہ اس قانون کا مقنن بہت ہی زبردست قدرت والا ہے کہ انسان کی عقل اسکے قانون کو سمجھنے کیلئے کافی نہیں ہے۔

نسیم سحری ایک مادی چیز ہے اور مادہ غیر ذی شعور چیز ہے اس میں شعور کسی ذی شعور ہی کی طرف سے ہے اور وہ ذی شعور ہستی مادہ نہیں ہو سکتی وہ ہستی خالق قادر علیم اور حکیم اور خبیر ہی ہے۔ سارے طبعی قوانین کا مقنن وہی ہستی ہے جو علیم و حکیم ہے۔ جسکو خدا کہتے ہیں خواہ پودوں میں غزا بنانے کا ضیائی عمل ہو جسکو انگریزی میں photosynthesis کہتے ہیں خواہ جڑوں میں عمل نفوذ ہو جس کو Osmatic pressure کہتے ہیں۔ خواہ پانی میں قوت اچھال ہو۔ جب سارے طبعی خوانین کا مقنن اللہ ہے تو قوانین میں اثر بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے خوانین پر حکومت بھی مقنن ہی کی ہے وہ قادر ہونے سے کسی قانونی کی تاثیر کو منسوخ بھی

کر سکتا ہے خواہ اگ ہو خواہ پانی ہو کہ آگ جلانے پر قادر نہ رہیگا اور پانی ڈبونے پر قادر نہ رہیگا۔ بہر حال غیر شعوری مادہ نہ تو قانون بنا سکتا ہے اور نہ اسکو نافذ کر سکتا ہے۔ انسان کی عقل اسباب کو نہیں سمجھ سکتی کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی صفات کا مظہر ہے۔

مزاج مؤمن : (۱) مؤمن چیزوں کو انکے ظاہر کے اعتبار سے نہ دیکھے بلکہ ان کے باطن کے اعتبار سے دیکھے۔ (۲) مؤمن منفی سوچ سے مکمل طور پر پاک ہوتا ہے۔ (۳) اس کی تمام تر سوچ مثبت سوچ ہوتی ہے۔ (۴) رزق کی تلاش کا کام مؤمن کا ہے اور تلاش کے نتیجے کا تعلق خدا سے ہے یعنی اسباب کا تعلق محنت سے ہے اور محنت کے نتیجے کا تعلق توکل سے ہے۔ (۵) آدمی پورے عزم کے ساتھ کسی کام کو انجام دے اور پوری طاقت لگا دے مگر نتیجہ اللہ پر چھوڑے۔ یعنی محنت کو خدا پر نہ چھوڑے ، بلکہ نتیجہ محنت کو خدا پر چھوڑے۔ (۶) اپنی شخصیت کی تکمیل کیلئے لوگوں سے ملتے رہو اختلاط ضروری ہے لیکن اس میں اپنے دین کو زخمی نہ کرو۔ یعنی متاثر کرنے کے بجائے اثر قبول کرنے لگ جائے۔ (۷) زندگی خارجی حقیقتوں سے موافقت کا نام ہے کہ جس طرح ہم ہوا، بارش، دھوپ، پہاڑ سمندر وغیرہ سے موافقت کر کے اس دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں اسی طرح یہی اصول انسانوں کے بارے میں بھی ہے کہ آپ انسانوں سے موافقت کے اصول پر معاملہ کریں تو دنیا انسان کیلئے خوشی اور عافیت کی جگہ بن جاتی ہے۔ کیونکہ مذہب انسان سے پیار کا نام ہے۔ مذہب کا اصل مقصد یہی ہے کہ انسان کی اصلاح ہو جائے تو بقیہ چیزوں کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ جو شخص صرف ضرورت کو اپنا معیار بنائے وہی

شخص قناعت کو پاکر مطمین زندگی گزار سکتا ہے اور جو خواہش کو معیار بنالے اس کو نہ قناعت جیسی نعمت مل سکتی اور نہ اطمینان زندگی۔

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

دعاہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف و جملہ معاونین و اہل وعیال کو اجر کثیر سے نوازے اور اس کتاب کو ان کی میزان میں حسنات کا ذخیرہ بنادے اور اس کا نفع عام فرمادے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آخرت کا یقین، عقل سلیم اور فکر مستقیم عطافرمائے۔

مؤلف

قاری محمد ارشاد علی

مولوی عالم (نظامیہ) بی۔کام (عثمانیہ)

ڈی۔ یف۔ ی۔ ناگپور کالج

باہتمام

صاحبزادہ محمد طاہر علی

اشوک نگر، بی۔ایچ۔ای۔یل

حیدرباد

مزید موضوعات

https://islahitohfa.com